⊙ روبینہ کوثر

پی ایچ ڈی اسکالر، شعبہ اردو، جی سی یونیورسٹی، فیصل آباد

⊙⊙ ڈاکٹر ظفر حسین ہرل

اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ اردو، جی سی یونیورسٹی، فیصل آباد

اردو ناول میں فلسفیانہ تصورات کی روایت

Abstract:

Novel is imitation of life. Novelists present a whole life in his novel. Every man has its own words view which is his philosophy. The philosophy of life is the basic theme of every novel. It does not mean that a novelist wants to explain any moral lesson or philosophy like a philosopher. The tradition of philosophical and moral concept in Urdu novels began from very first novelist Deputy Nazeer Ahmad. After him, philosophical concepts in novel were promoted by Rashid-ul-Khari, Praim Chand, Sajjad Zaheer, Qurat-ul-Ain Haider, Ahsan Farooqi, Abdullah Hussain, Khadija Mastoor, Jamila Hashime, Intazer Hussain, Bano Qudseea, Raheem Gul and Mirza Athar Baig. This research article focuses on above said novelists. These novelists have different philosophical views which are explored in this article.

Keywords:

Novel Philosophy Philosophical Ideas Rashid-ul-Khari Baig Bano Intzar Jamila Mastoor Qurat-ul-Ain Haider Gul

ناول کا تعلق زندگی سے ہے۔ ہر ناول نگار اپنے ناول میں زندگی کا کوئی نہ کوئی تجربہ پیش کرنے کی کوشش کرتا ہے۔اس تجربے کا تعلق ناول نگار کی زندگی سے گہرا ہوتا ہے۔ کیونکہ یہ تجربہ ہی ناول نگار کا ذاتی تجربہ ہوتا ہے جو وہ اپنی زندگی میں مشاہدات سے حاصل کرتا ہے۔وہ تجربہ جو وہ ناول میں بیان کرتا ہے وہ بھی اہمیت کا حامل ہے اور اس کے ساتھ ساتھ ناول نگار کی اپنی ذات بھی اپنی جگہ مسلمہ حیثیت رکھتی ہے کیونکہ انسان کے جذبات واحساسات کے بغیر کوئی بھی کام مکمل نہیں۔ یہی جذبات واحساسات کو لے کر ناول نگار کہانی کا تانا بانا بنتا ہے اور ان جذبات واحساسات کو ایک خاص

نقطہ نظر سے پیش کرتا ہے اور زندگی سے متعلق اپنے تجربات ناول میں بیان کرتا ہے۔ ناول نگار کی شخصیت اس کی تخلیق کردہ ناول کی دنیا میں کہیں عیاں تو کہیں پنہاں رہتی ہے۔ اس کا فن زندگی کا آئینہ دار ہوتا ہے اور اگر کسی فن کار سے یہ توقع کی جائے کہ وہ اپنی ہستی کو اپنے فن سے الگ کرے تو یہ توقع عبث ہے کیونکہ مصنف کے لیے یہ امر ناممکن ہے۔ وہ زندگی کے متعلق گہرا نقطہ نظر رکھتا ہے اور یہ نقطہ نظر مشاہدہ سے زندگی سے حاصل کرتا ہے۔ یہی مشاہدہ اس کے تجربے کی روح رواں بن جاتا ہے۔ وہ زندگی کی مکمل تصویر تو پیش نہیں کر سکتا لیکن اس کے کسی ایک پہلو کو ضرور منتخب کر سکتا ہے اور اپنی رائے کا اظہار کرے گا۔ یہ پہلو اخلاق، فلسفیانہ، سیاسی، مذہبی، روحانی، معاشی اور نفسیاتی بھی ہو سکتا ہے لیکن ان میں زندگی کی کوئی نہ کوئی قدر ضرور موجود ہوتی ہے۔ ناول کو لکھتے ہوئے ناول نگار کی حیثیت مفکر کی سی بھی ہے اور مفسر کی بھی، جو زندگی کو سوچتے ہوئے اس کی تفسیر بیان کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ ناول نگار اخلاقیات کا ایک استاد بن کر منظر عام پر نہیں آتا جو قاری کو پند و نصائح کی باتیں بتائے۔ بلکہ ایک ایسے مفسر کی طرح کام کرتا ہے جو ناول کے ذریعہ فلسفہ حیات قاری تک پہنچاتا ہے اور باتوں ہی باتوں میں قاری کو گہرے فلسفے سے آگاہ کرتا ہے۔ سلام سندیلوی لکھتے ہیں:

> ''پہلا طریقہ یہ ہے کہ ناول نگار خود ہی پردے کے سامنے آجائے اور اپنے نقطہ نظر کی وضاحت کر دے اور کرداروں پر روشنی ڈال کر اپنا فلسفہ حیات پیش کر دے۔ دوسرا طریقہ یہ ہے کہ اس میں ناول نگار اپنے مواد اور کرداروں کو اس انداز سے پیش کرتا ہے کہ ہم خود ہی اس کا فلسفہ حیات سمجھ جاتے ہیں۔''(۱)

ناول میں فلسفہ حیات کافی اہمیت کا حامل ہے۔ اس سے مراد یہ بھی نہیں ہے کہ ناول نگار ایک فلاسفر کی طرح کوئی اخلاقی سبق یا فلسفہ ہی بیان کرنا چاہتا ہے لیکن وہ فلسفہ سے اپنے دامن کو نہیں بچا سکتا۔ البتہ اتنا ضرور ہے کہ کچھ ناولوں میں یہ رنگ زیادہ گہرا اور واضح ہوتا ہے تو کہیں مدہم، فلسفہ حیات کے بارے میں ڈاکٹر احسن فاروقی لکھتے ہیں:

> ''چونکہ ناول نگار کا مطمع نظر زندگی کو پیش کرنا ہے لہٰذا یہ ممکن ہی نہیں کہ اس کی تصویر زندگی، اس کے عام اخلاقی و فلسفی و مذہبی وغیرہ خیالات کی حامل نہ ہو۔ یہ ممکن ہے کہ ناول کے قصہ میں کوئی خاص نظریہ مضمر نہ ہو مگر پھر بھی ناول نگار زندگی کو اپنے نقطہ نظر سے دیکھتا ہے۔ بعض چیزوں کو پسند اور بعض کو ناپسند کرتا ہے اس لیے اس کی ناول میں ہم کو فلسفہ حیات کی بابت کچھ نہ کچھ اشارے ضرور ملتے ہیں۔ ہر ناول نگار ایک فلسفہ حیات کا عکس پیش کرتا ہے۔ خواہ وہ عکس کتنا دھندلا کیوں نہ ہو۔''(۲)

ناول نگار جب زندگی کا گہرائی سے مطالعہ کرتا ہے تو اس مشاہدے کی بدولت وہ کوئی نہ کوئی فلسفہ اخذ کرتا ہے اور پھر اُسے داستان بناتے ہوئے عام قارئین کے سامنے لے آتا ہے۔ ناول میں کرداروں کے ذریعے انسانی جذبات کا اتار چڑھاؤ اور باہمی تعلقات کی پیچیدگیاں کچھ اس انداز سے بیان ہوتی ہیں کہ ناول نگار کا سارا فلسفہ کسی نہ کسی نتیجہ پر پہنچ کر منظر عام پر آجاتا ہے۔ ہر فرد اپنی الگ سوچ اور رائے رکھتا ہے۔ یہی سوچ فکر کی بلندی پر پہنچ کر اس شخص کا فلسفہ بن جاتی ہے۔ چونکہ ناول نگار عام آدمی سے زیادہ حساس اور باخبر ہوتا ہے اس لیے زندگی کے معاملات کے متعلق اس کی رائے اتنی ہی مؤثر اور اس کا فلسفہ اتنا ہی گہرا ہوتا ہے۔ ڈاکٹر احسن فاروقی **ناول کیا ھے؟** میں لکھتے ہیں:

> ''ناول نگار کو اس زندگی سے سروکار ہے جو لارنس (Lawrence) کے الفاظ میں وہ پوشیدہ زندگی ہے جو اس نیم مردہ جسم میں جسے ہم زندگی کہتے ہیں چھپی ہوئی ہے۔ ناول ان سب رائیوں، خیالوں، نتیجوں، احساسوں اور قدروں کے ملنے جلنے سے ظہور میں آتا ہے جو ناول نگار کے ذہن میں بھرے ہوئے ہیں۔ واقعات اور کردار نہیں بلکہ ان کی بابت ناول نگار کے لیے خیالات و احساسات ناول کا مواد ہیں۔'' (۳)

ناول نگار جب اپنے تجربے اور مشاہدے سے دنیا کے بارے میں کوئی فلسفیانہ سوچ قائم کرتا ہے تو پھر اسے ناول میں بیان کرتا ہے۔ اس لیے ناولوں میں کہیں رجائیت ہے تو کہیں مایوسی و ناامیدی، کہیں صدیوں کے تجربات تو کہیں اخلاقی اقدار و روایات کی پاسداری قائم رکھنے کے لیے کوششیں۔ اردو ناول میں جن فلسفیانہ موضوعات پر زیادہ بحثیں ملتی ہیں ان میں دنیا کی بے ثباتی، انسانی عمر کا اس قدر مختصر عرصہ، جبر و قدر کا مسئلہ، انسان اس دنیا میں کتنا مجبور و بے بس ہے اور کتنا خود مختار و آزاد، تقدیر کی کیا حقیقت ہے؟ تقدیر واقعی موجود ہے یا نہیں؟ وقت کیا چیز ہے؟ انسان وقت پر کتنی دسترس رکھتا ہے؟ وقت کا جبر کس قدر انسان کو مجبور و لاچار کر سکتا ہے؟ خیر و شر کیا ہے؟ روح کیا ہے؟ روح کا آغاز و اختتام کب سے ہے؟ موت کیا چیز ہے؟ فرد کی داخلی کش مکش کیا معنی رکھتی ہے؟ انسان کی نفسیاتی الجھنیں کس حد تک اس کے کردار پر اثر انداز ہوتی ہیں؟ وجود کی حیثیت کیا ہے؟ حیات و ممات کیا ہے؟ تہذیب و معاشرت کا زوال، یہ وہ سوالات ہیں جن کے گرد اردو ناول میں اب تک لکھا جا چکا ہے اور ان تمام موضوعات کا تعلق فلسفے کے بنیادی مباحث سے ہے۔ اس لیے کہہ سکتے ہیں کہ اردو ناول فلسفے سے الگ نہیں۔ ڈاکٹر ممتاز احمد خان لکھتے ہیں:

> ''ناول ہمیں کہاں کہاں تک پہنچاتا ہے، اس کا ادراک کرنے سے جو بصیرت حاصل ہوتی ہے اس سے قنوطیت اور مایوسیوں کی دھند چھٹ جاتی ہے اور یہ درس دیتی ہے کہ بظاہر یہ سمجھنا کہ واقعات پر ہمارا کنٹرول نہیں دھچکا لگاتا ہے لیکن بباطن زندگی کو چیلنج سمجھ کر مصائب کے خلاف جہاد کرنے سے نتائج پر صبر اور برداشت سے انسان کی عظمت کا سراغ ملتا ہے۔'' (۴)

غدر ۱۸۵۷ء کا واقعہ ہندوستان میں بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ اس واقعہ نے سیاسی لحاظ ہی سے انقلاب برپا نہیں کیا بلکہ سماجی اور اخلاقی قدروں کو بھی ہلا کر رکھ دیا۔ ادب جس کا تعلق ہی کسی بھی زمین سے ہوتا ہے، جب وہاں تبدیلی رونما ہو تو پھر یہ ناممکن ہے کہ ادب میں تبدیلی نہ آئی ہو کیونکہ جب زمین تبدیل ہوتی ہے تو آسمان بھی بدل ہی جاتے ہیں۔ غدر ۱۸۵۷ء سے پہلے اردو ادب میں زیادہ تر تمثیلیں، قصے، کہانیاں، حکایتیں اور داستانوں کا عام رواج تھا۔ خیالی دنیا اور مافوق الفطرت عناصر کا عمل دخل زیادہ اور حقیقت سے شناسائی کم تھی۔ الہ دین کا چراغ اور الف لیلہ کے ہوائی قالین کا چار سو چرچا تھا۔ ان کی جگہ اب بجلی کی روشنی اور ہوائی جہاز کا سفر ممکن ہوا کیونکہ غدر ۱۸۵۷ء کے واقعہ نے ہر صاحب دماغ پر یہ بات واضح کر دی تھی کہ ہماری سب سے بڑی کمزوری حقیقی زندگی سے دوری ہے۔ یہی وہ دور ہے جب ادب میں سنجیدہ اور حقیقی موضوعات کی طرف رجحان بڑھنے لگا۔

سرسید احمد خان اور ان کے رفقاء کی تحریریں قوم کو حقیقت کا آئینہ دکھانے لگی۔ اسی دور میں ناول کا آغاز ہوا اور

مولوی نذیر احمد نے اپنی بچیوں کی اصلاح وتربیت کے لیے کہانی لکھنا شروع کی جو بعد میں مرأۃ العروس کے نام سے طبع ہوئی۔ گو اردو ادب میں اردو ناول کا آغاز اتفاقیہ صورتِ حال کے نتیجہ میں ہوا لیکن مولوی نذیر احمد نے تمثیلی تکنیک کے ذریعے ایک ایسی صنف ادب کی بنیاد رکھی جو فی زمانہ کافی اہمیت کی حامل تھی۔ آج اگر عالمی ادب کا مطالعہ کیا جائے اور پھر اردو ناول کو دیکھا جائے تو اردو ناول میں فلسفیانہ مسائل، عصری مسائل کی جھلک موجود ہے اور بہت سے علوم کو اس میں بیان کیا جا چکا ہے جس کی بنا پر ناول کا ہیئتی، اسلوبیاتی اور موضوعاتی کینوس خاصا وسیع ہو چکا ہے اور مولوی نذیر احمد نے جس پودے کا بیج بویا تھا وہ آج ایک تناور درخت بن چکا ہے۔ مولوی نذیر احمد شعوری طور پر اصلاح انسانی کرنا چاہتے تھے جس کے نتیجہ میں انھوں نے مرأۃ العروس لکھا۔ بعض اوقات فن کار کوئی فن کا نمونہ پیش کرتا ہے جس کے نتیجہ میں کوئی نہ کوئی مقصد سامنے آ جاتا ہے اور بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ مقصد پہلے سے طے ہوتا ہے۔ فن بعد میں تخلیق کیا جاتا ہے۔ مولوی نذیر احمد کے ہاں بھی مقصدیت پہلے سے طے ہوتی تھی اور فن وہ بعد میں تخلیق کرتے تھے۔ اسی مقصدیت کے نتیجہ میں انھوں نے اخلاقی اقدار کی پاسداری کا فلسفہ اپنے ناولوں میں بیان کیا۔ ان کے کردار اصغری، اکبری، توبۃ النصوح اور ابن الوقت ناولوں میں ان کا فلسفہ بیان کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ چونکہ وہ ایک کٹر مولوی تھے اور واعظ، ان کے مزاج کی یہی خطابت فلسفہ بن کر ان کے ناولوں میں جاری وساری ہے۔ ان کے ناول پہ انھیں انعامات بھی ملے اور اس وقت کی درسی کتب کے طور پر تعلیمی اداروں میں بھی شامل کیے گئے۔ ان کے ناول بنات النعش، توبۃ النصوح، محصنات اور ابن الوقت میں بھی ان کا اصلاحی واخلاقی فلسفہ موجود ہے۔

نذیر احمد کے بعد اردو ناول میں سرشار کا نام آتا ہے جنھوں نے اپنے ناول فسانۂ آزاد کی بدولت بے پناہ مقبولیت حاصل کی۔ ان کا کردار خوجی اس معاشرہ کا نمائندہ ہے جو سماجی درجے کے فلسفے میں آ جاتا ہے۔ سرشار نے ایسے سماجی وتہذیبی حالات کی عکاسی کرنے کے لیے تخلیق کیا۔ اسی سے سماجیات کے بارے میں بہت سی معلومات ملتی ہیں۔ ناول فسانۂ آزاد کو اس حد تک پہنچنے پر فلسفیانہ ناول کہا جا سکتا ہے۔ خوجی کے کردار میں ایک مجبورِ فطرت انسان کا فلسفہ ملتا ہے جسے جبر کے فلسفے سے منسوب کیا جا سکتا ہے۔ انسان اس کائنات میں تمام اختیارات رکھتے ہوئے بھی اکثر معاملات میں بے بس ولاچار ہے اور اپنی مرضی سے کچھ کرنا بھی چاہے تو حالات اس کا رخ موڑ دیتے ہیں۔ ڈاکٹر حسرت کاسگنجوی لکھتے ہیں:

> ''ہم دیکھتے ہیں کہ کوئی انسان ایسا نہیں ہو سکتا جو کسی نہ کسی وقت مجبوری میں پڑ کر یہ نہ کہے کہ اگر اس کے پاس فلاں فلاں چیز ہوتی تو وہ اس مجبوری پر ضرور قابو پا لیتا۔ اس لیے ہم کہہ سکتے ہیں کہ خوجی ایک فلسفہ کردار ہے اور اس کی حد تک ''فسانۂ آزاد'' ایک فلسفیانہ ناول ہے۔''(۵)

عبدالحلیم شرر نے مسلمانوں کی پرانی تاریخ کو از سرِ نو زندہ کرنے اور مذہب اسلام کو عیسائیت سے بہتر ثابت کرنے کے لیے ناولوں کا سہارا لیا۔ شرر نے مشہور تاریخی ہستیوں کے ذریعے فلسفہ حیات بیان کرنے کی کوشش کی۔ ان کا ناول فردوس بریں فلسفہ جبر وقدر کا نمائندہ ناول ہے جو اردو ادب میں ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔ ان کے دیگر ناولوں ملک العزیز ورجینا، حُسن انجلینا، فلپانا اور فتح اُندلس میں اسلامی تاریخ کو بیان کرتے ہوئے شرر نے

اسلامی فلسفہ کی نمائندگی کی ہے اوران ناولوں کے ذریعے اسلام کی عظمت کو زندہ کرنا چاہا ہے۔شرر کے بعد مرزا محمد ہادی رسوا اُردو ادب کے اہم ناول نگار ہیں جنھوں نے اپنے ناول امراؤ جان ادا کی بنا پر بے پناہ شہرت حاصل کی۔اس ناول میں انھوں نے معاشرے کی حقیقی تصویر کشی کی ہے۔اس میں انھوں نے لکھنؤ کی معاشرت،تہذیب اور پھر زوال کی منظر کشی کی ہے۔ادا کا کردار واقعاتی چیز ہے جو حالات کے رحم و کرم پہ ہے۔حالات اسے کس سمت لے جاتے ہیں۔وہ مجبور و لاچار ہے۔ہادی رسوا نے اس ناول میں تقدیر کا فلسفہ بیان کیا ہے کہ کس طرح انسان تقدیر کے ہاتھوں بے بس و لاچار ہو جاتا ہے اور تقدیراُسے کہاں سے کہاں لے جاتی ہے۔ادا محض ایک طوائف ہے لیکن وہ لکھنؤ کی تہذیب کی نمائندہ ہے۔کس طرح یہ تہذیب زوال پذیر ہوئی اور تقدیر نے کیسے پانسا پلٹا، یہ کردار اس زوال پذیر معاشرے کا نمائندہ ہے جو سماجی درجے کے فلسفے میں آجاتا ہے۔بلاشبہ اس ناول کو فلسفیانہ ناول کہہ سکتے ہیں۔ہادی رُسوا نے ادا کی صورت میں اس کی خودداری، اس کا تجزیہ، فلسفہ حیات، سب بیان کرنے کی کوشش کی ہے مگر ہم اس کی روح تک پہنچنے سے قاصر ہی رہتے ہیں۔بیسویں صدی کے شروع میں پریم چند، راشد الخیری کے نام نمایاں ہیں۔

راشد الخیری نے بھی مولوی نذیر احمد کی طرح اصلاحی و اخلاقی ناول لکھے لیکن ان کے نزدیک زیادہ تر عورتوں کی بھلائی اور بہتری مقدم تھی۔سیدہ کا لال، جوہر قدامت منازل اسائرہ، بنت الوقت، صبح زندگی، شام زندگی ان کے نمائندہ ناول ہیں۔معاشرتی، اخلاقی اقدار کا فلسفہ ان کے ناولوں کا اہم موضوع ہے۔ہندوستان کے معاشرے کا سماجی استحصال، ناانصافی، ہندومت کے قدیم رسم و رواج کے خلاف بغاوت، نچلے طبقے کا استحصال پریم چند کے ناولوں کے موضوعات ہیں۔ان کے ناول بیوہ، بازارِ حسن اور نرملا ان موضوعات کی نمائندگی کرتے ہیں۔گئودان اور میدان عمل میں تحریک آزادی کا عروج اور انقلابی رجحانات کی ترجمانی ملتی ہے جبکہ گوشۂ عافیت اور چوگان ہستی میں جدید و قدیم معاشرے کی کش مکش کی عکاسی کی گئی ہے۔یہ وہ دور تھا جب زندگی بے یقینی اور عدم تحفظ کا شکار تھی۔سماجی و اخلاقی اقدار کا زوال رونما ہو رہا تھا۔سماج کی فلاح و بقا کے ساتھ ساتھ فرد کی انفرادی حیثیت کا اعتراف بھی ضروری تھا۔پریم چند ان تمام فلسفہ ہائے زندگی کی نمائندگی اپنے ناولوں میں کرتے ہیں۔ڈاکٹر احسن فاروقی لکھتے ہیں:

> ''پریم چند میں اگر کوئی نقص ہے تو یہ ان کے ناولوں میں اور روحانیت غالب نظر آتی ہے۔
> حالانکہ روحانیت ہندوستانی زندگی کا ایک جزو خاص ہے اور روحانیت یقینی ہندو فلسفۂ حیات کا
> جزوِ اعظم ہے۔''(۲)

سجاد ظہیر نے لندن کی ایک رات میں معاشی انصاف اور آزادی و مساوات کا فلسفہ بیان کیا ہے اور مختلف کرداروں کے ذریعے یہ بات باور کروانے کی کوشش کی ہے کہ معاشی انصاف کس حد تک ہر فرد کے لیے ضروری ہے۔عصمت چغتائی فرد کی انفرادی شخصی آزادی کی قائل ہیں۔ان کا ناول ٹیڑھی لکیر فرد کی ذاتی زندگی میں کسی کی مداخلت پسند نہ کرتے ہوئے فلسفہ پر بات کرتا ہے۔ان کا خیال ہے کہ فرد آزاد پیدا ہوا ہے اور وہ سماجی و معاشرتی کسی بھی پابندی کا پابند نہیں ہے۔وہ نئے دور کے انسان کو زمانی و مکانی بندشوں سے آزاد تصور کرتی ہیں۔کرشن چندر بھی عصمت چغتائی کی

طرح فرد کی شخصی آزادی کے قائل ہیں۔ان کا ناول شکست جنسی لذتیت سے پر ہے لیکن ان کا مقصد اصلاح ہے۔کرشن چندر مشاہدے اور گہرے مطالعے سے کام لیتے ہیں اور ظالم سماج کے ہاتھوں فرد کی آزادی کا گلا گھٹتا ہوا نہیں دیکھ سکتے۔ عزیز احمد کے ناول ھوس، مرمر اور خون اور گریز میں جنسی اور طبقاتی گھٹن کی طرف اشارے ہیں۔عزیز احمد کے ناولوں کے کردار انقلاب کی خاطر جان کا نذرانہ بھی پیش کرتے ہیں اور خوابوں کو زندہ کرنے کی خاطر کسی بھی قربانی سے دریغ نہیں کرتے۔ان کے ناول آگ میں انھوں نے کشمیری عوام کے جذبہ آزادی کو بیدار کر کے انقلاب میں سرگرم دکھایا ہے۔کسی بھی انقلاب کا تعلق اس معاشرے کے فلسفے کے ساتھ ہے۔معاشی انقلاب کے پیچھے ہمیشہ کوئی نہ کوئی فلسفہ کارفرما رہا ہے۔ایسی بلندی ایسی پستی میں تحریک آزادی کی جدوجہد، لگن، جوش اور امنگ موجود ہے۔ناول کا اختتام اس سوالیہ نشان پر مصنف نے چھوڑا ہے کہ فرد کس سماج میں جگہ پائے گا۔

برصغیر میں آزادی سے پہلے عزیز احمد، کرشن چندر اور عصمت چغتائی ناول لکھ رہے تھے۔آزادی کے بعد قرۃ العین حیدر کے ناول میرے بھی صنم خانے اور سفینۂ غم دل میں موضوعاتی نیرنگی ہے۔قرۃ العین حیدر کے ناولوں میں ناسٹیلجیا کا احساس، تقسیم ہند کے نتیجہ میں معاشرتی اقدار و کلچر کی ٹوٹ پھوٹ، خوف، ڈر، مختلف اندیشوں کے تحت موت کا خوف حواس پر طاری ہونا اور وقت کا بھیانک روپ کس طرح فرد اور معاشروں کو بدل کر رکھ دیتا ہے ان تمام فلسفیانہ موضوعات کے گرد مصنفہ اظہار خیال کرتی ہیں۔ان کا تیسرا ناول آگ کا دریا ہے جس میں وہ وقت (Time) کی کرداریت، موت کے خوف، ہجرت، ماضی پرستی، غریب الوطنی کے احساس، تاریخی حشر سامانیاں اور مختلف فلسفوں کا انسانی سوچ پر کیا اثر ہوا بیان کیا گیا ہے۔ڈاکٹر سہیل بخاری لکھتے ہیں:

> ''قرۃ العین حیدر کے نزدیک وقت ایک ایسی حقیقت ہے جو ازل اور ابد کے سروں کو ملاتی ہے۔ اس کا تعین کرنے کی ضرورت نہیں کیوں کہ سب کچھ خواب کی طرح گزر جاتا ہے نیز یہ کہ یہ ایک ایسا دریا ہے جو اپنی رفتار سے بدستور بہہ رہا ہے اور جس کو روکنے، ٹھہرانے یا جس پر بند باندھنے کی انسان میں طاقت نہیں۔''(۷)

بلاشبہ وقت ایک زمانہ ہے اور خود اللہ تعالیٰ نے کہا کہ زمانے کو برا مت کہو کہ میں خود زمانہ ہوں۔ناول میں وقت اتنا بڑا فلسفہ ہے کہ اس کی گہرائی میں اترتے چلے جائیں اور تاریخ و علم البشریات سے حوالے سے لاتعداد معلومات حاصل کرتے جائیں۔وقت کے ساتھ ساتھ قرۃ العین حیدر کے ناولوں میں دنیا اور انسان کی بے ثباتی کا بھی گہرا فلسفہ موجود ہے کیونکہ وقت بہت ظالم ہے اور انسان چاہے کتنا ہی صاحب اختیار و آزاد ہو جائے آخر کار بے بس و لاچار ہے اور اُسے مکمل آزادی کبھی نصیب نہیں ہوئی۔جبر و قدر کے فلسفہ پر بہت سے ناول نگاروں نے لکھا ہے۔ڈاکٹر ممتاز احمد خان ''اردو ناول کے چند اہم زاویے'' میں لکھتے ہیں:

> ''جبر و قدر کے مسئلے پر مفکرین نے خاصا تحریر کیا ہے۔مطلق انسانی آزادی ناممکن ہے۔جہاں بس نہ چلے، جہاں نتائج بالکل برعکس آئیں وہاں تقدیر کا عمل دخل ہے۔انسان سوچتا کچھ ہے اور ہوتا کچھ ہے۔شاید ہی کوئی ناول ہو جہاں تقدیر کا عمل دخل نہ ہو۔''(۸)

ڈاکٹر احسن فاروقی کے ناول شام اودھ اور سنگم میں اسی فلسفے کے ڈانڈے ملتے ہیں۔احسن فاروقی ناول سنگم میں بتاتے ہیں کہ دنیا کی زندگی کھیل تماشے کے سوا کچھ بھی نہیں۔اصل زندگی تو آخرت کی زندگی ہوگی جوابدی اور لافانی ہوگی۔شام اودھ میں تہذیبی زوال کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔کس طرح تہذیبیں بنتی اور بگڑتی ہیں۔دنیا میں یہ تبدیلی کا عمل چاہے انفرادی ہو یا اجتماعی اپنا رنگ دکھا کے رہتا ہے۔قاضی عبدالستار اپنے ناولوں دارا شکوہ ،غالب، شب گزیدہ اورشکست کی آواز میں متحدہ قومیت اور مشترکہ ہندو مسلم کلچر کی نفی کرتے ہیں۔ہر قوم اور ہر مذہب کا الگ الگ فلسفہ اور نظریہ ہوتا ہے اور چاہے لاکھوں سال یہ قومیں اکٹھی رہ لیں لیکن ان کے نظریات وفلسفہ کبھی ایک نہیں ہوتے۔اپنے ناولوں میں انھوں نے یہی مؤقف بیان کیا ہے کہ ہندومت اور مسلمان تہذیبیں، روایات، اقدار، کلچر، مذہب،فلسفہ کبھی ایک نہیں ہوسکتے۔عبداللہ حسین نے قید میں مرد کے سماج میں جکڑے ہوئے بے بس ولاچار وجود اور باگھ میں بتایا ہے کہ آمریت کے زیرِ سایہ فرد پر جبر کا استحصال کس حد تک ہوتا ہے۔ناول باگھ کا ہیرو اسدوجودیت کے فلسفے کی نمائندگی کرتا ہے اور اداس نسلیں کا ہیرو نعیم ایک بے قرار روح کی نمائندگی کرتا ہے۔ناول پہلی جنگ عظیم سے لے کر تقسیم ہند تک کے تاریخی پس منظر کی عکاسی کرتا ہے۔خدیجہ مستور کا ناول آنگن بھی تقسیم ہند کے پس منظر میں لکھا گیا۔مصنفہ نے سیاسی ومعاشرتی فلسفہ رکھنے والے دومختلف خاندانوں کے درمیان سیاسی کش مکش کو بیان کیا ہے۔ڈاکٹر احسن فاروقی لکھتے ہیں:

> ''اس میں ایک گھر کے جو واقعات بیان ہوئے ہیں ان میں دلچسپی کے علاوہ ایک فلسفیانہ اور اشاراتی تاثر بھی موجود ہے۔''(۹)

فضل کریم فضل نے اپنے ناول خونِ جگر ہونے تک میں برصغیر میں ہونے والی تقسیم اور آزادی کے نتیجہ میں پیدا ہونے والے انقلاب کی بات کی ہے کہ کس طرح جب انقلاب رونما ہوتا ہے تو بے شمار جانوں کا نذرانہ دیا جاتا ہے۔جمیلہ ہاشمی نے تلاشِ بہاراں میں عورت کے حقوق کی سرخروئی کی بات کی ہے۔وہ عورت کو مکمل انسان سمجھتے ہوئے اس کے حق کے لیے آواز بلند کرتی ہیں جیسا کہ افلاطون نے عورت کو مکمل انسان کا درجہ دیا اور عورت کو اس قابل جانا کہ وہ کسی بھی ریاست کا ریاستی نظام بھی چلا سکتی ہے۔ان کے دوسرے ناول دشتِ سوس میں حسین بن منصور حلاج کے تاریخی کردار کی حقیقت پسندانہ عکاسی کی گئی ہے اور تاریخی کردار حسین بن منصور کے فلسفہ اناالحق کی تشہیر کی گئی ہے کہ کس طرح ایک فرد اپنی ذاتی سوچ اور فلسفہ کی خاطر استبدادی قوتوں سے ٹکرانے کا حوصلہ رکھتا ہے۔ڈاکٹر ممتاز احمد خان لکھتے ہیں:

> ''متصوفیانہ کرداروں کی پیش کش میں جمیلہ ہاشمی کا اپنا ایک منفرد مقام ہے۔ماضی کے اس قسم کے کرداروں کو ان کی مختلف انسانی جہتوں اور علمی،فلسفیانہ اور معاشرتی حوالوں سے زندہ کرنا ان کے ناولوں کا مخصوص اور یادگار حصہ ہے۔''(۱۰)

شوکت صدیقی نے اپنے ناول خدا کی بستی میں استحصال زدہ معاشرہ کی عکاسی کی ہے کہ کس طرح غربت وافلاس انسان کو مجبور ولاچار کر کے جرائم کی طرف مائل کرتی ہے۔معاشرے کی گھٹن، فلاکت، اقتصادی ومعاشی ناہمواری، افسردگی اور سماجی جبر انسان سے کیسے کیسے کام کروانے کے لیے مجبور کر دیتا ہے۔دوسروں کے حقوق غصب کرنا،

دوسروں کی محنت کا پھل لے جانا، مال واسباب چھین لینا انفرادی سطح پہ بھی یہ کام ہو رہا ہے اور اجتماعی سطح پہ بھی۔ان کے ناول چار دیواری اور جانگلوس میں بھی یہی فلسفہ ملتا ہے کہ ظالم مرے نہیں مزید قوت پکڑ رہے ہیں۔انتظار حسین نے چاند گھن اور آگے سمندر ھے سے اپنا ارتقائی سفر طے کیا۔ ''بستی'' میں تارکین وطن کا نوحہ، درد و کرب اور ہجرت کرنے کے مرحلہ کی اذیت بیان کی گئی ہے۔انتظار حسین کے ناولوں میں ناسٹیلجیائی رجحان عام ہے۔جب ہر طرف تاریکی اور ناامیدی ہو تو بشارت ہوتی ہے۔ان کے ناول تذکرہ میں خوف، دہشت، بے اطمینانی اور بے سکونی کی کیفیت کا اظہار ہے۔انسان کو نہیں معلوم کے ابتدا کے بعد اس کا اختتام کہاں ہوگا۔انسان پیدا کہیں ہوتا ہے اور مدفن کہیں، انسان نئی جڑوں کی تلاش میں سرگرداں تو رہتا ہے لیکن اپنی پرانی جڑوں سے بھی پیچھا نہیں چھڑا سکتا۔حجاب امتیاز علی تاج کا ناول پاگل خانہ، تیسری جنگ عظیم (ایٹمی جنگ) کی ممکنہ تباہ کاریوں کا تجزیہ کرتا ہے۔سائنس کی لاتعداد ایجادات کے باوجود انسان کو کہیں سکون میسر نہیں۔موت کے خوف کا راج ہر سو طاری ہے۔بچ کے جایا جائے تو کہاں جایا جائے۔موجودہ دور میں انسانی جان کو سینکڑوں خطروں کا سامنا ہے۔ناول کے کردار بے بسی اور لاچاری کا شکار ہیں۔ناول کا موضوع آج بھی زندہ موضوع ہے۔ایس ایم جمیل واسطی نے پنگل کا جزیرہ میں اسلامی نظام کی بالادستی اور اسلامی فلسفہ حیات کی عکاسی کی ہے اور غیر اسلامی وظالمانہ نظام کی ناانصافیوں سے پردہ اٹھایا ہے جس میں انسانوں کے ساتھ غلاموں سے بدتر سلوک کیا جاتا ہے۔ناول کا موضوع خیر وشر کا فلسفہ بیان کرتا ہے۔بانو قدسیہ کا ناول راجہ گدھ بہت سے حوالوں سے توجہ کا مرکز بنا۔ڈاکٹر محمد ہارون قادر لکھتے ہیں:

> ''اس ناول سے بانو قدسیہ کی ناول نگاری کا قد نمایاں ہوا ہے۔یہاں بانو کے فن پر ایمان لانا پڑے گا کہ اس نے زندگی کے ان گنت تجربات، حوادث محافل، علوم، ان کی باریک بحثیں، تصوف، طالب علموں کی زندگی، تہذیب و مذہب، فلسفہ حیات، اخلاقی اقدار غرض ایک وسیع سلسلہ حیات کا احاطہ کیا ہے۔''(۱۱)

مصنفہ نے اسلامی فلسفہ کے ذریعے رزقِ حلال اور رزقِ حرام سے پیدا ہونے والے انسانی جسم میں محرکات کا سراغ لگانے کی کوشش کی ہے۔انسان کے اندر پیدا ہونے والے پاگل پن اور دیوانگی کے اثرات دراصل رزقِ حرام کھانے کی بدولت پیدا ہوتے ہیں۔ناول میں انسان کی بے نام جستجو دکھائی گئی ہے۔وہ خود نہیں جانتا کہ اسے کس کی تلاش ہے، اپنی یا خدا کی۔مادیت پرستی کے اس دور میں انسان اپنے ہونے کے مقصد تک کو فراموش کر چکا ہے۔مصنفہ نے انسان کے اس خالی پن کا علاج روحانیت و تصوف میں تلاش کرنے کی کوشش کی ہے۔رضیہ فصیح احمد نے اپنے ناول صدیوں کی زنجیر میں بتایا ہے کہ آزاد فرد اور سماج کو کبھی بھی زنجیروں میں جکڑ کر نہیں رکھا جا سکتا۔سقوطِ ڈھاکہ کے بعد پاکستان مزید کسی سقوط کا متحمل نہیں ہو سکتا۔قومی وانفرادی آزادی کو کبھی سزائے موت نہیں دی جا سکتی۔کہیں مرد عورت کا استحصال کر رہا ہے تو کہیں فرد، فرد کا بے رحمی سے حق پامال کر رہا ہے۔ضروری نہیں کہ باہر سے کوئی زنجیریں لے کر آئے گا۔زنجیریں تو آس پاس موجود ہیں۔زندانی تو وقت ہے جو انسان کو صدیوں سے جکڑے ہوئے ہے۔رحیم گل جنت کی تلاش میں بتاتے ہیں کہ انسان ہمیشہ خوب سے خوب تر کی تلاش میں رہتا ہے۔وہ اُسی جنت میں جانا چاہتا ہے جس سے

کبھی وہ فرار حاصل کرنا چاہتا تھا۔ یہ ایک بے قرار روح کی داستان ہے جو ہر سفر میں بے قرار ہے اور اپنی اصل کی تلاش میں ہے۔ مصنف نے مذہب، سیاست، سماج، معیشت، اخلاق واقدار، تہذیب وتمدن جیسے موضوعات پر اظہار خیال کیا ہے۔ غلام الثقلین نے ناول میرا گاؤں میں انسان کو حاصل ہونے والے رزق کی حقیقت عیاں کرنے کی کوشش کی ہے اور اسلامی فلسفہ رزق اللہ کی طرف سے انسان کو عطا ہے جو ہر صورت اس کی قسمت کا اُسے مل کر رہے گا۔ انور سجاد کے ناول خوشیوں کا باغ میں تیسری دنیا کے باسیوں کے مسائل کی نشان دہی کی گئی ہے۔ جہالت اور جھوٹ سے کسی صورت بھی نجات ممکن نہیں۔ مستنصر حسین تارڑ بہاؤ میں عورت کو دھرتی ماتا کے برابر مقام دیتے ہیں جس طرح دھرتی زرخیزی و سیرابی عطا کرتی ہے اسی طرح عورت اپنی نسل کو پروان چڑھاتی ہے۔ مستنصر حسین عروج آدم خاکی کی بنیاد عورت ہی کو قرار دیتے ہیں جو تمام حالات کا مقابلہ انتہائی صبر آزما ہو کر کرتی ہے۔ مرزا اطہر بیگ کا ناول غلام باغ فکشن اور فلسفہ کا خوب صورت امتزاج مانا جاتا ہے۔ ڈاکٹر محمد ہارون لکھتے ہیں:

> ''غلام باغ'' میں فلسفہ ہے۔ اطہر بیگ تو یہاں تک کہتے ہیں کہ فلسفہ ہر ناول میں ہوتا ہے۔ فلسفہ اگر متن میں شیر وشکر ہو رہا ہے اور مرکزی فکر سے رچ بس کر، تحلیل ہو کر اس کی بقا و ارتقا کی ضمانت دے رہا ہے تو عمدہ ہے اور اگر وہ اکھڑے اور روکھے پھیکے انداز میں اوپر اوپر تیر رہا ہے تو وہ ناول اور ناول نگار دونوں کی کمزوری بن جائے گا۔''(۱۲)

حال ہی میں حسن منظر کا ناول العاصفہ منظر عام پر آیا ہے جس میں مصنف نے عرب تہذیب، تیل کی دولت، مغرب کا قبضہ جیسے موضوعات کو بیان کیا ہے۔ حسن منظر نے اس ناول میں عرب معاشرہ کی بے بسی، گھٹن اور کلچر کو مرکزی کردار زید بن سعید کے ذریعے اجاگر کیا ہے۔ انسان بے پناہ تخلیقی صلاحیتوں کا مالک ہے اور اس کے احساسات وجذبات میں کیسی رنگارنگ انفرادیت پائی جاتی ہے۔ کائنات کے اندر ہر انسان کے مشاہدات وتجربات مختلف ہیں۔ انسانی فطرت حیران کن حد تک پراسرار اور بھید بھری گتھیوں کا مجموعہ ہے۔ کتنا ہی کسی کو سمجھنے کی کوشش کی جائے پھر بھی کوئی نہ کوئی پہلو تشنہ رہ ہی جائے گا۔ اس کی ادنا سی کاوش ناول میں کی جاتی ہے کہ ان الجھی ہوئی گتھیوں کو سلجھایا جائے۔ اردو ناول میں فلسفیانہ تصورات کا جائزہ لیتے ہوئے یہ بات بڑے وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ فلسفیانہ تصورات اور اردو ناول کا چولی دامن کا سا ساتھ ہے۔ کوئی ناول ایسا نہیں جو فلسفیانہ تصورات کے بغیر لکھا گیا ہو۔ ہر ناول نگار اپنی اپنی فکر کے مطابق اظہار خیال کرتا ہے اور آنے والی صدیوں میں روح عصر کی ترجمانی اسی صنفِ ادب میں کی جائے گی۔

حوالہ جات

۱۔ سلام سندیلوی، ادب کا تنقیدی مطالعہ، (لاہور: میری لائبریری، ۱۹۶۳ء) ص: ۱۰۳۔۱۰۲

۲۔ احسن فاروقی، ناول کیا ہے؟، (علی گڑھ: ایجوکیشنل بک ہاؤس، ۲۰۰۶ء) ص ۳۸

۳۔ ناول کیا ہے؟ ص: ۴۶۔۴۵

۴۔ ممتاز احمد خان، اردو ناول کے چند اہم زاویے، ص ۲۰

۵۔ حسرت کاسگنجوی، ماہ نو، (کراچی: مارچ ۱۹۶۷ء) ص ۳۶

۶۔ ناول کیا ہے؟ ص ۱۴۶

۷۔ سہیل بخاری، اردو ناول کی تاریخ و تنقید، (لاہور: میری لائبریری، ۱۹۶۶ء) ص ۳۴۱

۸۔ اردو ناول کے چند اہم زاویے، ص ۲۱

۹۔ احسن فاروقی، ناول کا فکری پہلو، مشمولہ: ادبی تخلیق اور ناول، (کراچی: مکتبہ اسلوب، ۱۹۶۳ء) ص ۵۶

۱۰۔ ممتاز احمد خان، آزادی کے بعد اردو ناول، (کراچی: انجمن ترقی اردو پاکستان، ۱۹۹۷ء) ص ۲۵۶

۱۱۔ محمد ہارون قادر، اردو ناول کے ابتدائی دور کا فکری و فنی مطالعہ، مشمولہ: اردو ناول: تفہیم و تنقید، (اسلام آباد: ادارہ فروغ قومی زبان پاکستان، ۲۰۱۲ء)، مرتبین: ڈاکٹر نعیم مظہر، ڈاکٹر فوزیہ اسلم، ص ۱۸۵

۱۲۔ ایضاً، ص ۳۰۲